Mairaj
Vol 2, Issue 1
https://www.mairaj.pk
ISSN Online 2959-2089
editor.mairaj@gmail.com
ISSN Print 2959-2070

عفیفہ ناز
اسکالر پی ایچ۔ڈی اردو، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور۔

انتظار حسین: اردو ہندی تہذیب کا نباض

Afifa Naz
Ph.D Scholar, Islamia University , Bahawalpur.

Intizar Hussain: The Master of Urdu-Hindi Civilization

Intizar Hussain was a fiction writer with a novel use of symbolic and metaphorical styles, but for all his retrospect and escapism and denial of the future, his writings have a strange poignancy and beauty. It has the same charm one feels in old buildings on moonlit nights. Besides being a respected name in Urdu fiction, he was a great challenge to the pioneer fiction writers due to his style and changing tones. The atmosphere of his writings echoes the stories of the past. Regret, rememberance of past , love of the classics, nostalgia for the past, lamenting the past and seeking refuge in tradition are very prominent here. In many places, the style and tone become harsh in expressing the sadness and expression of the disintegration of the old values and the superficial and sentimental nature of the new values. He also made the mythological trend a part of his writings. Extensive study is also required to find out the mysteries of their legends. A special kind of tension regarding migration is ongoing with Intizar Hussain. He could not logically separate himself from this situation. He was not interested in the external structure of life, but he cared about the condition that was faced inwardly. This is the deep diving and stylistic diversity of Intar Hussain. But they also call it intellectual and visual backwardness. In such a case, they declare the moral struggle of the individual as meaningless. This thematic and stylistic level is where Intizar Hussain seems to enter the foreground of fiction.

Key Words: Symbolic and metaphorical styles, Retrospect, Escapism, Regret, Nostalgia, Urdu-Hindi Civilization, Mythological trend.

کلیدی الفاظ: توہمات، اوہام، بازیافت، تہذیبی علامتی نظام، ہندو مسلم تہذیب

انتظار حسین اردو فکشن کے ایسے ہی قلم کار ہیں جن کا ذہنی ارتقاء مختلف ادوار میں نئی نئی ادبی جہات کو متعارف کرواتا ہے۔ کہانی کار کا ذہنی سفر ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں پر محیط ہوتا ہے۔ وہ جب چاہتا ہے قاری کو کسی مخصوص فضا اور زمانے میں لے جاتا ہے اور واقعات کے تانے بانے بنتا ہے کیوں کہ اس کا پختہ تہذیبی شعور باریک بینی سے عوامل کا مشاہدہ کر کے فن پاروں میں ڈھلتا ہے۔ انتظار حسین اردو کے وہ تخلیق کار ہیں جن کا ذہن ہمیشہ متحرک رہا ہے وہ کسی ایک فکری رجحان کے پابند نہیں ہوئے یہی وجہ ہے کہ ان کا ذہنی ارتقا ترقی کی مختلف منازل طے کرتا رہا اور ادب کے قاری کو مختلف انداز سے متاثر کرتا رہا۔ انتظار حسین ۴۷ء کے بعد لکھنے والے گروہ میں سے ہیں۔ اس لیے ان کے ابتدائی کام جو نقطہ نظر ہوتا گیا وہ ایک گمشدہ تہذیبی زندگی کی بازیافت کا ہے اس دور کی تخلیقات میں ان کے فن کا سرچشمہ تہذیبی روایات کا منبع یعنی یادیں، خواب انبیاء کے قصے، دیومالا، توہمات، اوہام ہیں جو پوری ایک قوم کا اجتماعی مزاج ہے جسے وہ شعوری طور پر برت کے ہندو مسلم تہذیب کے مٹتے خدوخال کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انتظار حسین اس

تہذیب کے خدوخال اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ بے کار ماضی پرستی نہیں کہلاتی بل کہ وہ ایک بامعنی دنیا کے نمائندے بن کر ابھرتے ہیں جس کی واضح مثال انکے دونوں ابتدائی مجموعے گلی کوچے اور کنکری دوناولٹ دن اور داستان اور پہلا ناول چاند گہن ہیں۔ان سب تخلیقات میں یاد کو بنیادی محرک کا درجہ حاصل ہے کیوں کہ ان کے نزدیک یاد ہی وہ محرک ہے جس سے انفرادی واجتماعی زندگی کی بازیافت ممکن ہے بہ قول گوپی چند نارنگ:

"انتظار حسین کی دانست میں یاداشت انفرادی اور اجتماعی تشخص کی بنیاد ہے۔یاد داشت نہ ہو تو ماضی بھی نہیں رہتا اور ماضی نہ ہو تو بنیاد اور جڑیں کچھ نہیں رہتا۔گویا خود حال کی حیثیت ایک غیر مشخص غبار سے زیادہ نہیں۔یاد کے معنی ہیں اپنی ذات کے اجزائے ترکیبی کی شیرازہ بندی کرنا،اسے تہذیبی انفرادیت کا وقار بخشنا۔"(1)

یعنی یاد ہی قوم کو تہذیبی انفرادیت قائم رکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔انتظار حسین کے ہاں یہی یاد اور تہذیبی شعور احساس ایک گمشدہ دنیا کی علامت بنا کے پیش کرتے ہیں اسی سلسلے میں مجید مضمر رقم طراز ہیں:۔

"وہ اپنے فن میں ماضی کی تہذیبی،اخلاقی،روحانی اور معاشرتی قدروں کے زوال کا ایسا احساس عطا کرتے ہیں کہ قاری خود اس جنت کی تعمیر پر آمادہ ہو جائے جو اس سے چھن چکا ہے اقدار کے زوال کا یہ احساس افسانوں میں زیادہ شدید نظر آتا ہے جو انہوں نے ۱۹۵۸ء کے بعد لکھے۔"(2)

انتظار حسین کے تخلیقی سفر کے سوتے تقسیم وطن کے واقعہ،فسادات، نقل مکانی کی خارجی کیفیت سے پھوٹتے ہیں جنہیں انہوں نے ۱۸۵۷ء اور مسلمانوں کی ماضی کی ہجرتوں کے ساتھ ملا کے روحانی واردات کے طور پر قبول کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں ہجرت کا تجربہ مسلمانوں کا اجتماعی لاشعوری تجربہ ہے جو ۱۹۴۷ء میں خود کو دہرا رہا ہے وہ اپنے ایک انٹرویو میں اس حوالے سے کہتے ہیں:

" مسلمانوں کی تاریخ شروع ہوتی ہے ہجرت کے راستے سے ہجرت ہی کے حوالے سے ہمارا کیلنڈر بنا تو اسوقت میں اس گمان میں تھا کہ یہ اتنا بڑا تجربہ جو مسلمانوں اور مسلمانوں کی تاریخ کا مرکزی تجربہ ہے وہ ہمیں یکایک ایک حادثے کی وجہ سے مل گیا ہے اور ہمیں بہت کچھ دے گا۔"(3)

اسی تجربے نے ان کے ذہنی ارتقاء میں تہذیبی علامتی نظام کو تشکیل دیا جس کے توسط سے وہ گم شدہ تہذیبی دنیا کے خدوخال کو اجاگر کرتے ہیں انکے ہاں استعمال ہونے والی مذہبی اور تہذیبی علامتیں داخلی علامتیں ہیں کیوں کہ ان کا تعلق ان کے داخلی ذاتی شعور سے ہوتا ہے وہ جس مذہب کے پیرو ہیں جس تہذیب کے پروردہ ہیں وہ سب ان کے داخلی شعور کا حصہ ہیں اسی شعور سے تخلیقات میں علامتیں در آئیں ان علامتوں میں جہاں اسلامی تہذیب،قرآنی آیات،آسمانی صحائف، شیعی مسلک،ہندی اساطیر،انبیائے کرام کے قصوں،بدھ جاتکوں،تصوف سے اخذ کردہ علامتیں شامل ہیں۔یہ علامتی نظام داخلی شعور سے ترتیب پاتا ہے۔اپنے ہاں استعمال ہونے والی علامتوں ہیں ایک انٹرویو کے دوران انتظار حسین کہتے ہیں:

"میرے ہاں جو علامتیں آئی ہیں ان کا تعلق ہماری تاریخ سے تہذیب جو ہمارا مذہب ہے وہاں سے ہے۔"(4)

علامت خارج سے داخل میں سفر طے کرتی ہے اس لیے انتظار حسین کے ہاں ایسی بہت سی علامتیں پائی جاتی ہیں جن کا تعلق خارجی دنیا سے ہے مثلاً بازاروں کی چہل پہل،امام باڑوں کے پر ہجوم مجمعے،پتنگ بازی کے مشاغل، حویلیاں جنگل، توہمات کے سائے، خاموش محبتیں،درخت،پرندے، جانور وغیرہ یہ سب چیزیں انتظار حسین کے ہاں صرف خارج کی علامتیں نہیں رہتی ہیں بل کے انکے پیچھے تہذیبی حوالہ ہوتا ہے اور وہ خارج سے داخل کی طرف تہذیبی لاشعور کا عمل طے کر کے علامت کے مرتبے پر فائز ہوتی ہیں۔بہ قول ڈاکٹر شفیق انجم:

"انتظار حسین نے اپنے افسانوں ہیں خارجی رشتوں سے زیادہ داخلی تہذیبی رشتوں کو اہمیت دی اور داخل کی طرف اپنی سفر کی بنیاد تہذیبوں کے پاتال میں اترنے،اپنے آپ کو ٹٹولنے اور اپنی تھاہ تلاش کرنے پر رکھی۔"(5)

اس طرح انتظار حسین کے ہاں داخل اور خارج یکساں تخلیقی عمل کو مہمیز لگا کے فن پارہ تخلیق کرواتے ہیں۔انتظار حسین ہمارے عہد کے فن کار اور ہماری تہذیب کے بناض ہیں انکی علامتیں مخصوص تہذیبی پس منظر رکھتی ہیں جو داخل سے خارج اور خارج سے داخل کی طرف جست لگاتی رہتی ہیں وہ اپنے تخلیقی سفر کے دوران میں ان تہذیبی سانچوں کی طرف رجوع کرتے ہیں جو برصغیر پاک وہند کے لوگوں کے اجتماعی حافظوں میں محفوظ ہیں کیوں کہ ان کے نزدیک فن کار کے لیے اپنے تہذیبی وسماجی رویوں، طور طریقوں، محبت اور نفرت کی وارداتوں،رسومات،توہمات،معتقدات اور مذہبی زندگی کے ظاہری و باطنی پہلوئوں سے واقف ہونا از حد ضروری ہے اسی لیے ان کے تخلیقی سفر کا جائزہ لیا جائے

تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کہیں بھی اپنے تہذیبی و ثقافتی ورثے سے منہ موڑ کے بدیسی ورثے سے جڑنے کی کوشش نہیں کی۔ ہر دور میں ان کا رشتہ اپنی تہذیب سے جڑا رہا انہوں نے جتنی بھی علامتیں برتی ہیں ان کا تعلق تہذیبی زندگی سے جڑا ہوتا ہے کیوں کہ ان کا فن وسیع تہذیبی علامتی نظام کے تجربات اور کئی زمانوں سے شعور کا حامل ہے۔

انتظار حسین کے ہاں خاص طور پر تہذیبی شعور سے جنم لیتی ہیں اس لیے وسیع کائناتی مفاہیم کی حامل ہوتی ہیں اور مقرون سے مجرو کی طرف سفر طے کرتی ہیں اسی لیے وہ کہتے ہیں:

"مجرو صورت میں علامت Scholar کے لیے ہوتی ہیں میرے لیے تو یہ کہانیوں ہیں ملیجنڈ میں لپٹی ہوئی آتی ہیں نا تو وہ ہی میرے لیے معنی رکھتی ہیں۔ واقعہ کربلا سے جو کچھ علامتی رنگ آتا ہے وہ مجھے بہت Haunt کرتا ہے وہ واقعہ اور اس سے مجھے علامتیں بنتی نظر آتی ہیں اس واقعے نے پوری ایک Methodology پیدا کی ہے۔"(6)

لیکن انتظار حسین کے ہاں علامتیں اس وقت مجرو صورت میں برتی جاتی ہیں جب وہ مخصوص شیعی مفاہیم کی حاصل ہوتی ہیں مثلاً علم، اغلب، دلدل، امام، روضہ، خاک، شفا، امام باڑے کی محفلیں، گھوڑا، محرم الحرام کی تقریبات وغیرہ کیوں کہ ان کے معنی ایک مخصوص مسلم فرقے کے لیے تو علامتی نوعیت کے ہو سکتے ہیں لیکن انہیں وسیع کائناتی یا تہذیبی لاشعور کا اجتماعی حصہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

انتظار حسین محدود فکر کے تخلیق کار نہیں ہیں۔ کیوں کہ انتظار حسین مابعد الطبیعیاتی تہذیب کے پروردہ ہیں جہاں کائناتی نظام ہی علامتوں سے مزین سمجھا جاتا ہے لہذا ہر وہ شے جو مابعد الطبیعیاتی تصور کی حامل ہو گی کثیر المعانی تصور بھی دے گی جسے ایک سے زائد تعبیرات دی جا سکیں گی اسی لیے انتظار حسین کے ہاں استعمال ہونے والی علامتوں کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر تحسین فراقی اس حوالے سے بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"علامت کی ایک سطح وہ ہے جس پر ایک خاص سطح کا شخص خاص تعلیم پایا ہوا شخص اس کی تعبیر کر رہا ہے۔ دوسرا شخص اس کی کوئی اور تعبیر کر رہا ہے ایک اور شخص اس کی کوئی اور تعبیر کر رہا ہے۔ غرض بڑی شاعری اور بڑا متن وہی ہے جس میں کثیر المعنویت پائی جاتی ہے۔ اس کی تعبیریں مختلف ہو سکتی ہیں بڑی شاعری ہی اس کی مثال نہیں ہے بڑے افسانے بھی بڑے ناول بھی اس کی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ انتظار حسین جو افسانہ لکھتے ہیں ناول لکھتے ہیں ناول میں تو نہیں ان کے افسانوں ہیں خاص طرح کی علامتیں ہوتی ہیں۔"(7)

یعنی انتظار حسین کے ہاں ہونے والی علامتیں خاص تہذیبی حوالہ رکھتی ہیں۔ انتظار حسین نے جس دور لکھنا شروع کیا اس دور میں بعض لکھنے والے مخصوص انداز میں انسانی جبلتوں کو توجہ کا مرکز بنا کے اپنی تخلیقات میں پیش کر رہے تھے لیکن انتظار حسین نے ان جبلتوں کی بجائے انسانی تہذیبی و ثقافتی گروپیش پر توجہ مرکوز کر کے اسے سمجھنے کی کوشش کی کیوں کہ انسانی اعمال اور شخصیت کی تشکیل میں موروثی اثرات کے ساتھ ساتھ تہذیبی ماحول عقائد و تصورات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے ان کا تہذیبی نقطہ نظر ہجرت کے خاص لمحے سے جنم لیتا ہے یہ لمحہ فکری سطح سے اٹھ کے واردات کی سطح پر آجاتا ہے کیوں کہ انتظار حسین حقیقی و فن زندگی کے عمل میں شرکت کو سمجھتے ہیں جس سے حقیقی طرز احساس تشکیل پاتا ہے وہ اس حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ان لوگوں کی تحریروں سے علیحدہ میرے یہاں کوئی رویہ پیدا ہوا تو یہ کسی کتاب کی وجہ سے نہیں بلکہ ایک واردات کے حوالے سے ہوا۔ ابھی میں ان لوگوں کو پڑھ ہی رہا تھا اور یہ لوگ ایک طریقے سے میرے ہیرو بنے ہوئے تھے کہ تقسیم کا واقعہ گزر گیا اور مجھے ہجرت کرنی پڑی۔ میں نے ایک پوری خلقت کو ہجرت کرتے دیکھا۔ اس ہجرت کے عمل میں میں نے جس حال میں لوگوں کو دیکھا، وہ ایک نیا تجربہ تھا۔ میں نے ان لوگوں کو دیکھا جنہیں میں پہلے اور عالم میں دیکھ چکا تھا۔ میری تحریروں ہیں ان لوگوں کے خلاف رد عمل پیدا نہیں ہوا بلکہ زندگی کا ایک عمل تھا جو مجھے ان لوگون کے رویوں سے ہٹا کر ایک دوسری سطح پر لے گیا۔"(8)

ان کے افسانوں اور ناولوں میں دیومالائی قصے، داستانوی حکایات، مذہبی روایات، اولیاء انبیائے اکرام کے قصے، جنوں اور سایون کے مسکن، پرانی حویلیاں، جھاڑیاں، درخت، راستہ کاٹنے والی بلیاں، بستروں کے گرد چکراتے ہوئے سائے۔ دکھائی نہ دینے والی بشارتیں، دعائیں، گمشدہ دستاویزات اور شجرے یہ پوری کائنات ان کے کرداروں کے ساتھ مربوط، فعال اور موثر انداز میں علامتی معنویت کی حامل ہے۔ ان کے تخلیقی ادب میں تہذیبی و تاریخی اہمیت کو علامتی انداز میں اس طرح پیش کیا گیا ہے ان کے تہذیبی نقطہ نظر سے علامت کے منصب کو جدا نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ ان کے نزدیک علامت تہذیبی پس منظر کے بغیر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اسی لیے ان کے ابتدائی علامتی شعور میں وسوسے اور واہمے مابعد الطبیعیاتی تہذیب کی اہم علامتوں کے طور پر آتے ہیں۔ بہ قول سراج منیر:

"توہم عوام کی Metaphysics بھی ہے اور Metahistory بھی اور اسی ادارے کے حوالے سے انسانوں کے درمیان رشتوں کی معنویت اور انسان اور کائنات کے درمیان رشتے کی حیثیت کا تعین ہوتا ہے۔ چنانچہ صحیح معنوں میں انتظار حسین کے تجربے کا بنیادی سٹرکچر یہی اوہام کا نظام ہے جو کہانیوں میں ڈھلتا ہے۔"(9)

یہ مابعد الطبیعیاتی سطح انتظار حسین کے ہاں اجتماعی شعور کی علامت بن کے بھی اپنی پہلی حیثیت کو اوجھل نہیں ہونے دیتی کیوں کہ اس کے پیچھے یاد کا طویل سلسلہ ہوتا ہے جو اسے حاضر کا استعارہ بناتی ہے یوں انتظار حسین کی علامتیں کلیشے نہیں بنتیں۔ ان کا علامتی شعور ابتدا ہی میں فکر کے تین زاویوں علامت، ہجرت اور ماضی کی مثلث پر استوار ہوا ہے۔ یہ تینوں زاویے مسلم تہذیب اور ہندو مسلم تہذیب کے تہذیبی و ثقافتی پس منظر وقت کے ساتھ رونما ہونے والے تغیرات کے بالمقابل مثبت کردار کی علامت ہیں اپنے اس تاریخی و تہذیبی ربط کے بارے میں انتظار حسین لکھتے ہیں:

" کھوئے ہوئوں کی جستجو کرتا ہوں اور آتش رفتہ کا سراغ لگاتا پھرتا ہوں۔ آتش رفتہ کے سراغ کا سلسلہ شروع ہو جائے تو بات سن ستاون تک محدود تو نہیں رہ سکتی۔ پہنچنے والا میدان کربلا تک بھی جا سکتا ہے کہ یہ ہماری تاریخ کی اولین آگ ہے۔ اسی آگ سے تو ہمارے سارے الائو گرم ہوئے ہیں۔"(10)

انتظار حسین کے نزدیک علامتوں کا سرچشمہ تاریخ و مذہب ہیں اسی لیے جب کوئی ایسی صورت حال دیکھتے ہیں جس سے ملتی جلتی حالت ماضی کا حصہ رہی ہے تو تہذیبی لاشعور کی زبان آرکی ٹائپس (Archetypes) کے سانچے شعور کے سامنے ظاہر ہو جاتے ہیں اور اپنا ظہور علامت میں کرتے ہیں یوں ان کے ہاں شعور اور لاشعور کا تعلق علامتوں کی صورت قائم رہتا ہے اسی لیے ڈاکٹر سلیم اختر رقم طراز ہیں:

" انتظار حسین کی علامتیں اساطیر اور قدیم داستانوں سے پھوٹتی ہیں اور یہ اس کا کمال ہے کہ اس نے سینکڑوں سال قبل کے واقعات سے علامات اخذ کر کے انہیں ''آج'' کا ترجمان بنا دیا ہے۔"(11)

یعنی انتظار حسین کے ابتدائی علامتی شعور کا منبع تہذیبی روایات ہیں جو یاد، ماضی، ہجرت، خواب، انبیا کے قصے دیومالائی کہانیوں، اوہام و توہمات پر مشتمل ہیں۔ یہ علامتیں انکے قومی اجتماعی مزاج، کردار اور شخصیت اور شعور و احساس سے جنم لے کر تہذیبی لاشعور کا حصہ بن جاتی ہیں جنہیں وہ اپنی تخلیقات میں برتتے ہیں۔ ابتدائی تخلیقات میں انتظار حسین کے ہاں بہت سے موضوعات کی تکرار کا احساس ہوتا ہے لیکن وہ اس تکرار کو اہل مشرق کا خاصہ گردانتے ہیں کہ ماضی سے ان کی محبت ہر وقت انسان کے ساتھ چلنے والی حقیقت میں ڈھل جاتی ہے وہ ۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس کی انتہائی صورت ۴۷ء میں تقسیم کے المیہ کو روحانی واردات کے طور پر قبول کرتے ہیں یہی تقسیم کا ملک کا واقعہ، فسادات نقل مکانی ان کے ابتدائی ذہنی ارتقاء کے بنیادی محرک اور تجربے ہیں وہ اس ۴۷ء کی تقسیم کو تاریخ ہیں مسلمانوں کی مختلف ادوار میں کی جانے والی ہجرتوں کا تسلسل قرار دے کے اسے اجتماعی تہذیبی واردات کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ ان کے ابتدائی ذہنی سفر کا رتقا ہجرت کے بعد تہذیبی اقدار و روایات کے گم ہونے کی بازیافت کرتا نظر آتا ہے اور وہ اس تہذیب کی بازیافت تہذیبی علامتوں کی صورت میں کرتے ہیں۔ اس دور میں واقعات و مناظر، کردار و مقامات کے توسط سے گم شدہ ماضی کی بازیافت علامتی پر کی گئی ہے اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ انتظار حسین اپنے ابتدائی ذہنی ارتقاء میں سماجی اور معاشرتی علامتوں کو برتتے ہیں جن کا تعلق ہمارے رسم و رواج اور اجتماعی توتوہماتی پہلو سے ہے۔ یہ علامتیں محدود سطح پر ان کے ہاں آرکی ٹائپس Archetypes کی اہمیت اختیار کر گئی ہیں۔ اس تخلیقی دور میں جو اسلامی اساطیر بطور علامت برتی گئی ہیں ان کا تعلق ایک مخصوص فرقے سے ہے جیسے علم، دلدل، صلیب، گھوڑا وغیرہ۔ ان علائم کے نمائندہ افسانے ''اجودھیا''، '' پھر آئے گی''، '' عقیلہ خالہ''، '' ایک بن لکھی رزمیہ''، '' یاں آگے درد تھا''، ''آخری موم بتی''، ''ساتواں در'' اور ''کنکری'' ہیں۔

ہندو مسلم تہذیبوں کی بنیاد چوں کہ مابعد الطبیعیات پر ہے اسی لیے ثقافتی سرگرمیوں میلوں، تہواروں، گلیوں، حویلیوں، درختوں، پرندوں وغیرہ کو آفاقی علامتوں کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔ اسی لیے انتظار حسین نے بھی اپنے ابتدائی ذہنی ارتقاء کے سفر میں انھی آفاقی علامتوں کو برتا ہے۔ عہد حاضر کے معنی کلچر سے پہلے معاشرہ پیچیدہ گیوں اور منافقتوں کا حامل نہیں تھا اور انسان ایک ایسی علامت تھا جب کہ آج کا انسان اپنا ذاتی تشخص کھو چکا ہے اس دور میں انتظار حسین کا ذہنی ارتقا فن کی نئی سمت دریافت کرتا ہے جس میں انسان کے اخلاقی و روحانی زوال اور وجودی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اسی لیے انتظار حسین کے ذہنی ارتقا کی دوسری منزل ان کا افسانوی مجموعہ '' آخری آدمی'' ہے جس میں دنیاوی آلائشوں اور منفی جذبوں کے سامنے انسانوں کی بے بسی اور وجود کی ادنی سطح پر گر جانے کو علامتی انداز میں موضوع بنایا گیا ہے جو انسان کے روحانی اضطراب کو ظاہر کرتا ہے۔

اس تخلیقی سفر میں انتظار حسین وہندی اساطیر سے رشتہ جوڑتے ہیں وہ اسلامی اساطیر سے مراد وہ آسمانی صحائف، صوفیہ کے ملفوظات، لوک روایات، انسانی اوہام، شیعی عقائد، داستانوی کردار اور انسانی رسوم و رواج لیتے ہیں جس میں عرب و عجم اور ہندوستان کے لوگوں کے مشترک تجربات کا ظہور ہوا ہے وہ ان اساطیر حوالوں، علامتوں

تمثیلوں اور حکایتوں سے اپنے کرداروں کی تعمیر و تشکیل میں مدد لیتے ہیں۔ فضاسازی کے ساتھ ساتھ کردار نگاری بھی اس دور کی اہم خصوصیت ہے اس دور کے حوالے سے بات کرتے ہوئے گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

" پہلے فرد پر معاشرے کو یا کردار پر ماحول کو ترجیح حاصل تھی۔ اب پورا وجود اور اس کے مسائل مرکز نگاہ بنتے ہیں، اب محض خارجی مشاہدہ ہی کافی نہیں، باطن کی آنکھ بھی کھلتی ہے۔ بعد کی کہانیوں ہیں زیادہ توجہ ذات کے باطنی منظر نامے، وجود کی نوعیت وماہیت، اخلاقی و روحانی زوال اور داخلی رشتوں کے بھیدوں اور رازوں پر مرکوز ہونے لگتی ہے۔"(12)

اس دور میں انتظار حسین انسانی اخلاقی و روحانی زوال پر نوحہ کناں ہیں کہ کس طرح انسان دنیا کی چکا چوند میں گم ہو کے اپنا مقصد حیات فراموش کر کے بیٹھا ہے عہد حاضر کی ترقیوں نے اسے بے بس کر دیا ہے وہ چاہتے ہوئے بھی اس سے منہ نہیں موڑ سکتا اور اپنے نفس کے ہاتھوں مجبور ہو کے، بندر، کتے، مکھی اور بکرے کی جون بدلتا رہتا ہے۔ بہ قول سجاد باقر رضوی:

"انتظار حسین کے افسانوں ہیں انسان بدی کی طرف مائل نظر آتا ہے اور بدی کی طرف مائل ہونے میں سارے انسان برابر ہیں۔ انتظار حسین غالباً اردو کے پہلے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے انسانوں کے اخلاقی و روحانی زوال کی کہانی مختلف زاویوں سے لکھی ہے۔"(13)

اس دور میں برتے گئے علامتی طریق کار کو معاشرے کی علامتوں اور تہذیبوں شعور کا ماحصل کہا جا سکتا ہے کیوں کہ انتظار حسین نے علامت نگاری کی مغرب تکنیک سے اپنے مشرقی مواد کو برت کے اردو فکشن میں نیا تجربہ کیا۔ اسی لیے گوپی چند نارنگ رقم طراز ہیں:

" انتظار حسین کا یہ حوصلہ معمولی نہیں کہ وہ اجنبی جزیروں میں قدم رکھتے ہیں اور آدم زاد کو ڈھونڈتے ہیں۔ انسان خود کو بندروں، بکروں اور کتوں کے درمیان پا کر آنسو بہاتا ہے جانور اسے خموشی کی زبان گویا ہیں تنبیہ کرتے ہیں کہ اے بدبخت تو جس جزیرے میں ہے وہاں ایک ساحرہ حکومت کرتی ہے جو اس کی محل سرا میں جاتا ہے، جانور بن جاتا ہے۔ یہ جزیرہ عاقبت سرائے دنیا ہے اور ساحرہ عہد حاضر کی ترقیاتی اور یہ سب سے پہلے آدمی تھے پھر بندر، کتے اور بکرے بنتے چلے گئے۔ اس ساحرہ کے محل سرا میں انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ بندروں، کتوں اور بکروں کے درمیان چلتے ہوئے وہ اذیت سے سوچتا ہے کہ کب تک اپنے تئیں برقرار رکھ سکے گا۔"(14)

۱۹۷۱ء پاکستانی کہانی کا اہم موڑ ہے اس وقت پاکستان میں رہنے والے ہر فرد کو اپنی ذاتی اور قومی استحکام کی بہ یک وقت ضرورت تھی کیوں کہ اس دور میں پاکستان کا نصف حصہ کٹ کے جدا ہو گیا تھا جب سیاسی سطح پر کوئی خاص اہمیت نہ دی گئی اسی لیے عوام میں انفرادی پہچان کا مطالبہ بہت بڑھ گیا اسی عوامی مطالبے کے پیش نظر پاکستانی ادیبوں نے علاحدہ قومی و تہذیبی تشخص کا سوال اٹھایا اسی قومی تشخص کے متلاشی دور میں انتظار حسین کا مجموعہ شہر افسوس منظر عام پر آیا۔ اسی مجموعے سے ان کے ذہنی ارتقا کے تیسرے سفر کا آغاز ہوا جس میں سیاسی و سماجی مسائل پر کہانیاں لکھی گئیں۔ انتظار حسین کا ناول بستی بھی اسی دور کی تخلیق سمجھا جا سکتا ہے کیوں کہ اس کا موضوع بھی پورے معاشرے کا زوال ہے جو ملک کی سیاسی و سماجی جہات کو بے نقاب کرتا ہے۔ یہ دور ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۲ء تک کے درمیان لکھی گئی کہانیوں کا دور ہے۔ جن ہیں انتظار حسین نے وجودی و اخلاقی مسائل سے انسان کے سیاسی و سماجی مسائل کی طرف جست لگائی اس دور میں ان کے ہاں کوئی اسلوبیاتی تبدیلی نظر نہیں آتی کیوں کہ یہ کہانیاں دوسرے دور والی تمثیلی، حکایتی انداز میں لکھی گئی کہانیاں ہیں لیکن ان میں محرکات کی تبدیلی موجود ہے جو انتظار حسین کے ذہنی ارتقا کی معنی خیز اور فکر انگیز جہت کو سامنے لاتی ہیں۔ اس میں ان دکھوں کا بیان کیا گیا ہے جو تقسیم کے زخم مندمل نہ ہونے پر ایسی ملکی صورت حال کے پیش نظر ہر فرد کے اندر پنپ رہے تھے۔ انتظار حسین نے انہیں اظہار کا راستہ دیا اس لیے یہ مجموعہ ماضی کی بازیافت سے ہٹ کر حال کے دکھوں اور بے حسیوں کو پیش کرتا ہے اس دور میں جہاں انتظار حسین سقوط مشرقی پاکستان اور سیاسی بے حسی پر نوحہ کناں ہیں وہیں وہ اسرائیل عرب جنگوں سے پیدا ہونے والی صورت حال سے بھی چشم پوشی نہیں کرتے بہ قول ڈاکٹر انوار احمد:

" انتظار حسین جو اپنے معاشرے کی حسیات کا نباض ہے، ۱۹۶۷ء کی اسرائیل عرب جنگ کے نتائج کے تہذیبی اثرات پہ نوحہ کناں ہو کر، محرم الحرام اور کانا دجال، جیسے افسانے تخلیق کرتا ہے۔"(15)

اس دور کے افسانوں میں اسلامی اساطیری علامتوں کو استعمال کر کے سیاسی سماجی اور تہذیبی نقوش کو تلاش کیا گیا ہے۔ انتظار حسین کے تخلیقی سفر کے متحرک ہونے کے بارے میں شمیم حنفی کی رائے ہے:

" انتظار حسین کا تخلیقی سفر، چھوٹی بڑی ہزار یا قیدوں سے رہائی کی ایک مسلسل جستجو کا سفر ہے۔"(16)

یہ سفر اپنا چوتھا پڑاؤ بودھی اور ہندو دیومالائی دور میں کرتا ہے اور انتظار حسین اپنے ذہنی ارتقا کی اس جہت میں عہدہ وسطیٰ کے داستانوی انداز سے پیچھے عہد قدیم کی مختلف اساطیری راویتوں کو باہم ملا کر زندگی کی صداقتوں کے ساتھ آریائی، اسلامی اور قبل اسلامی اساطیری رواتیوں کے تناظر میں پیش کرتے ہیں جس کی نمائندگی تخلیق افسانوی مجموعہ کچھوے ہے جس میں انسانی نفسیاتی کہانیوں کو بودھی جاتکوں اور دیومالائی کی کہانیوں کی مدد سے علامتی پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ بدھ کی جاتکوں سے اپنے تعلق کو انتظار حسین یوں بیان کرتے ہیں:

"جب میں جاتکیں پڑھتا ہوں تو مجھے نظر آتا ہے کہ انسان، یہ انسان تو اس انسان کے مقابلے میں جسے انیسویں اور بیسویں صدی کا مغربی ادب پیش کرتا ہے بہت بڑی اور وسیع چیز ہے۔ یہ کتنی صدیاں سانسیں لے رہی ہے اس کے اندر صدیاں کیا بلکہ کتنے ہی Millennium اس کے اندر سانسیں لے رہے ہیں جب فرد آتا ہے ان جاتکوں میں، کوئی ایک آدمی نمودار ہوتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ اس عہد ہی میں زندہ نہیں ہے بلکہ بہت سے عہد سمیٹ کر لایا ہے؟ اور کائنات اتنی بڑی نظر آتی ہے کہ جس میں زمین و آسمان اور ساری مخلوق سمائی ہوئی ہے۔"(17)

اس دور میں انتظار حسین بدھ جاتکوں کی مدد سے انسانی زوال کہانی بیان کرتے ہیں کہ کس طرح مایا، موہ، خوف، شک و دغا، نفس پرستی نے اسے نفسیاتی طور خوار کر رکھا ہے۔

اس دور میں انتظار حسین کے ہاں چار طرح کی کہانیاں ملتی ہیں کو کچھوے، خیمے سے دور، خالی پنجرہ اور شہر زاد کے نام مجموعوں میں شامل ہیں ان مین ایک تو سیدھا سادا اسلوب ہے دوسرا اسلوب ہندو مسلم اساطیری روایات سے اخذ کردہ ہے تیسرے اسلوب کی نمائندہ وہ کہانیاں ہیں جو برصغیر پاک و ہند کے زمینی رشتوں اور یاداشتوں کو کھنگال کے بنی گئی ہیں چوتھی قسم کی کہانیوں میں اسلوب طنزیہ ہو گیا ہے اور موجودہ دور کو قدیم معاشرے میں دکھا کے عصری صورت حال کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ یہاں انتظار حسین الف لیلہ اور کلیلہ و رمنہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور آج کے انسان کی بے حسی و بے بسی کو طنزیہ انداز میں نشانہ بناتے ہیں۔ ان چاروں ادوار میں انتظار حسین انسان کے کھوئے ہوئے مقام کے متلاشی ہیں وہ اس یقین کی تلاش میں ہیں جو مستقبل کے انسان کو شعور و آگہی دے سکے اس کا وجود برقرار رہ سکے اس تلاش میں وہ گمشدہ تہذیب، پرانے عہد نامے، انجیل، قصص الانبیاء، دیومالا، بودھ جاتکوں، پرانوں، داستانوں اور صوفیہ کے ملفوظات سے استفادہ کرتے ہیں بہ قول گوپی چند نارنگ:

"انتظار حسین کا ذہن ایک متحرک ذہن ہے اور اس کا سیال سفر جاری ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آگے چل کر اس کا رخ کن نئی زمینوں کی طرف ہو گا۔"(18)

انتظار حسین وہ تخلیق کار ہیں جنہیں تہذیبی نظام کی پختگی کے عمل میں انسان کے چھوٹے ہونے کا شدت سے احساس ہے۔ اسلیے ان کی تحریریں اپنی تاریخیت اور ذات کے ظہور کو دریافت کرنے اور اس کائنات سے اپنا راستہ استوار رکھنے کی پرہمت کاوشیں ہیں جو برصغیر کی اسلامی روایات کو مادی روایت میں ڈھلنے سے بچاتی ہیں۔

علامت نگاری کے رجحان نے خارجیت سے باطن کی طرف رجحان پیدا کیا اس طرح زندگی کی حقیقی تصور کشی کے لیے داخلی خلا میں سفر کا آغاز ہوا۔ اسکے توسط سے ماضی پرستی نہیں بل کہ کہنہ روایات کو زندہ کر کے ماضی کی روشنی سے حال کے اندھیروں کو روشن کیا گیا۔ علامتی تخلیقات کی بنیادی خصوصیت ہے کہ اجتماعی شعور کی بناء پر ماضی کے واقعات کو موجودہ صورت حال میں ڈھالنے کے لیے علامتوں کا استعمال کیا جائے اس طرح علامت ایک پل کی مانند ہوتی ہے جو ماضی اور حال کو آپس میں ملاتی ہے اردو فکشن میں اس کی نمایاں مثال انتظار حسین ہیں۔ انتظار حسین کے ہاں عام سے عام شے کا ذکر بھی تہذیبی روایت کے بغیر نہی ہوتا یعنی ان کے ہاں ہر شے اپنے تہذیبی سیاق و سباق میں استعمال ہو کے علامت کا روپ دھارتی ہے۔ انکے ہاں افراد اور تہذیبی سطح میں جو رشتے زندہ ہیں ان کا تعلق اشیا اور مقامات سے گھر، پرانی حویلیاں، نیم کے پیڑ، بلیاں، الو، آسمان پر اڑتی چیلیں، پرانے کھنڈر سب کے سب انسانی صورت حال سے منسلک ہیں جن کے بدلتے ہی افراد کے درمیاں رشتوں کی نوعیت بھی تبدیل ہو جاتی ہے جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

"فسادات کے دنوں میں ہماری بستی کی چڑیوں نے یکایک صبح کو چہکنا بند کر دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ کوئی آفت آنے والی ہو تو چڑیاں پہلے سے سونگھ لیتی ہے اور ان شاخوں سے ہجرت کر جاتی ہیں۔"(19)

یعنی ان کے نزدیک افراد اور اشیا کے درمیان مربوط ربط کا ذریعہ تہذیبی تعلق ہے جسے وہ علامتی انداز میں پیش کرتے ہی ں ان کے فن میں وسوسوں اور داہموں سے پوری ایک کائنات تشکیل پاتی ہے جو علامتی حیثیت کی مالک ہے کیوں کی ان کے ہاں جن وہموں اور وسوسوں کا ذکر ہے وہ خود ساختہ نہیں ہوتے بل کہ انکے پیچھے مخصوص تہذیبی پس منظر ہوتا ہے جس کا وہ علامتی اظہار ہوتے ہیں بہ قول سراج منیر:

" انتظار حسین خلقت کے جس حافظے پر بڑا زور دیتے ہیں اس کا سب سے اہم ادارہ توہم ہے کہ جس کے ذریعے پوری مابعد الطبیعیات وجود میں آتی ہے جو خلقت کا خواب بھی ہے اس کا عقیدہ بھی اور اس کی کہانی بھی۔"(20)

انتظار حسین کا تعلق چوں کہ مابعد الطبیعیاتی تہذیب سے ہے جہاں صوفیائے کرام وہم کو'' سلطان العارفین'' کہتے ہیں جو انسان کے متوازی کائنات کو ایک متصادم صورت حال سے منسلک کرتا ہے۔ اسی لیے وہم اور شگون کو ہمارے ہاں متشدد رویے کے طور پر نہیں لیا جاتا کیوں کہ یہ اساطیری مزاج کا وہ تخلیقی رویہ ہے جو مابعد الطبیعیات کو وجود میں لاتا ہے اور انتظار حسین کا ابتدائی اساطیری مزاج انہیں اہام پرستی، شگون کی پاسداری، کائناتی مظاہر اور انسانی فطرت سے تشکیل پاتا ہے۔

"جب گھر میں املی یا نیم کا پیڑ نہیں تھا اس گھر میں کبوتروں کی چھتری تھی۔ جس گھر میں کبوتروں کی چھتری نہیں تھی اس گھر میں کوئی امام باڑہ تھا۔ ایک گھر خالی تھا جسکی کوئی نشانی نہیں تھی۔ پھر بھی اس گھر کو سب جانتے تھے۔ اس میں جن جو رہتے تھے۔ گویا ہمارے محلہ کا ہر مکان ایک فرد تھا۔"(21)

یہ وہ بنیادی تصورات جن پر انتظار حسین کی تہذیبی علامتوں کا ہیولا تشکیل پاتا ہے کیوں کہ انتظار حسین زوال پذیر تہذیبی علامتوں کو از سر نو دریافت کر کے ان کی مدد سے اپنے عہد کے باطن میں اترنے کی کوشش کرتے ہیں:

" علامتوں کے زوال اور اس کے باعث فکر احساس کے سانچوں کے بکھرنے کا احساس آج سے مخصوص ہے۔ گم ہوتی ہوئی علامتوں کو پھر سے شعور کا حصہ بناتے اور بکھرتے سانچوں کو پھر سے منظم دیکھنے کی خواہش، یہ ہے کہ آج کی حسرت تعمیر۔"(22)

انتظار حسین اپنی علامتوں کے ذریعے تہذیب نفس کے اس مرکزی نظام کی جستجو میں جو گم ہو چکا ہے۔ انکے ہاں تہذیبی، اساطیری، مذہبی علامتیں بھی ملتی ہیں جن کے توسط سے وہ ماضی کی سیاحت پر نکلتے ہیں۔ وہ ان علامتوں کو تاریخ و تہذیب کے حصار سے باہر نکال کر رنج والم کی لازماں حقیقت سے منسلک کر دیتے ہیں۔ اس طرح علامت ان کے ہاں پیرایہ بیان کے ساتھ ساتھ وہ راستہ بھی ہے جو تجربے کے حقیقی سرچشموں تک پہنچاتا ہے۔

انتظار حسین شعوری طور پر جدید دور میں رہتے ہوئے بھی لاشعور سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کر پاتے اور ماضی کی یاد ان کے ساتھ رہتی ہے یوں وہ مختلف زمانوں میں بیک وقت سفر کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی زمانی سفر کے دوران وہ اپنی تخلیقات میں جن علامتوں کو برتتے ہیں وہ شعوری اور لاشعوری سطح پر مدغم ہو کر ان کے قلم سے صفحہ قرطاس پر جھلکتی ہیں ان کا شعور کہیں بھی ان کے تہذیبی لاشعور اور آرکی ٹائپس سے بچ نہیں پاتا کیوں کہ کوئی بھی قلم کار نہ تو شعور سے نجات پا سکتا ہے نہ لاشعور سے۔ کیوں کہ ان دونوں کے ملاپ سے ہی فن ترقی کے منازل طے کر سکتا ہے یہی لاشعور کا ملاپ انتظار حسین کے ہر دور میں فن کے جھلکتا دکھائی دیتا ہے جو قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے اسی لیے ڈاکٹر اعجاز راہی لکھتے ہیں:

" انتظار حسین کے افسانے پہلو دار مفہوم کے ساتھ پڑھنے والے کے احساس کو مسلسل جھنجھوڑتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی بڑی خوبی (کہ یہ نئے افسانے کی اجتماعی خوبی ہے) کہ وہ دل کی بجائے ذہن کو متاثر کرتے ہیں کہ سچائیاں دل سے نہیں ذہن سے علاقہ رکھتی ہیں۔"(23)

انتظار حسین کے ہاں آفاقی اور تاریخی وویومالائی (Architypes) علامتوں کا استعمال زیادہ ہے جو قدیم دیومالائوں، پرانوں، داستانوں، قصوں، کہانیوں، اساطیر و ساتیر، مقدس صحائف سے ماخوذ ہوتی ہیں لیکن وہ دوسرے افسانہ نگاروں کے برعکس ان علامتوں کے مسلمہ اور معلوم معنوں میں تبدیلی کر کے انہیں خارجی و دنیا کے حالات کے مطابق مفاہیم دیتے ہیں۔ لیکن ان کی یہ تبدیلی علامت کو تجرید نہیں بننے دیتی۔ اسی لیے ''شہزاد منظر'' اپنے مقالے'' افسانے میں رمز و علامت کا استعمال'' میں اثبات کے قائل ہیں:

" اردو افسانے میں داستانی فضا پیدا کر کے عصری حقیقتوں کو علامت کے ذریعہ پیش کرنے میں انتظار حسین نے جس قدر کامیابی حاصل کی ہے کسی دوسرے نے نہیں کی۔ اس سلسلے کی طرح داستانوں کی علامات، صوفیائے کرام کے ملفوظات اور پرانے عہد نامے کے علامتی حوالہ جات سے پورا استفادہ کیا ہے۔"(24)

یہی وجہ ہے کہ انتظار حسین کی تخلیقات خارجی زندگی کے پہلو بہ پہلو داخلی یا باطنی زندگی کی اہمیت کو اجاگر کر کے شعور ذات کے عنصر کو جلا بخشتی ہیں۔ اس کی وجہ ان کا تہذیبی لاشعور ہے جو پوری طرح ان کی فکر پر حاوی ہے اس سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ:

میرے ساتھ یہ ایک عجیب قصہ ہے کہ جب کوئی واردات گزرتی ہے کوئی سانحہ گزرتا ہے تو میں اسے اسی عہد میں رکھ کر نہیں دیکھتا بلکہ ایک پوری عملی جو Psyche ہے قوم کی، پوری جو تاریخ ہے قوم کی اس حوالے سے اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔"(25)

اس لیے ان کے ہاں ہجرتوں کے حوالے سے جو تہذیبی پس منظر استعمال ہوتا ہے کہ وہ اس سے جو علامتیں اخذ کرتے ہیں وہ ان کی شعوری علامتیں ہیں کیوں کہ وہ ماضی تاریخ کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے ہیں کہ ہم کس دور میں کس تاریخی عمل سے گزر کر کہاں پہنچے یہ سب معلوم ہونا چاہیے اس حوالے سے بات کرتے ہوئے انہوں نے ایک انٹرویو میں کہا:

"ہمارے حافظے میں ہماری تاریخ رہنی چاہیے کہ ہماری تاریخ کیا ہے ہم کہاں سے چلے تھے کتنا ہم نے سفر کیا وہ سارا سفر جو ہے ہمارا وہ ہمارے شعور کا حصہ ہونا چاہیے۔ شعور کا حصہ ہو گا تو وہ ہماری زندگیوں میں ہمارے رہن سہن میں کسی نہ کسی حد تک برقرار رہے گا۔"(26)

اپنے حافظے کی بازیافت میں وہ اسلامی تہذیب کے ساتھ ساتھ ہند اسلامی تہذیب سے بھی بھرپور استفادہ کرتے ہیں جس سے ان کے فن اور علامتی سٹرکچر میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔

شعوری کاوشوں کے ساتھ ان کے ہاں لاشعور کی کاوشیں بھی نظر آتی ہیں وہ جہاں شعوری طور پر اپنے تہذیبی نقطہ نظر کو ہند اسلامی تہذیب سے وابستہ کرتے ہیں وہیں کچھ علامتیں انکے مسلک سے وابستہ بھی نظر آتی ہیں جنہیں انکی لاشعوری طور پر برتی جانے والی علامتیں کہا جا سکتا ہے کہ جب انتظار حسین مکہ سے کوفہ پہنچنے کی بات کرتے تب ان کے سامنے وسیع اسلامی تہذیب کے اہم شہر ہوتے ہیں جن کی اہمیت سے مسلمان انکار نہیں کر سکتے لیکن جب وہ مکہ کوفہ اور واقعہ کربلا سے ہٹ کے خاک شفائ، دلدل، اغلب، گھوڑے، محافل، محرم الحرام وغیرہ کا کثرت سے کرتے ہیں تو وہ ان کے لاشعور کی علامتیں کہلائیں گی کیوں کہ شعوری کاوش سے تاریخ و تہذیب تو یاد رکھی جا سکتی ہیں لیکن تہواروں اور رسومات کا یاد رکھنا اور بیان کرنا بالکل لاشعوری عمل ہی ہو گا جو انتظار حسین کے ہاں تکرار سے برتا ہوا نظر آتا ہے۔

انتظار حسین ۱۹۴۷ء میں ہونے والی تقسیم کے وقت ۲۲ سال کے تھے اس لیے وہ خون ریز صورت حال سے باہوش وحواس گزارے جو تب کے لوگوں نے زبردست کی یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں اس تجربے کی بازگشت علامتی انداز میں سنائی دیتی ہے۔ اس کی وجہ بتاتے ہوئے وہ ایک انٹرویو کے دوران کہتے ہیں:

" یہ برصغیر کی تاریخ کا اتنا بڑا واقعہ ہے اتنا بڑا تجربہ ہے کہ برصغیر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا یہ کوئی معمولی تجربہ نہیں ہے تاریخ نے یہاں ایک بالکل نیا موڑ لے لیا ایک نیا ملک بن گیا تو میں اس تجربے سے ابھی تک نکل نہیں پایا۔"(27)

وہ اپنی تخلیقات میں ہجرت اور اس سے وابستہ ماضی کی گمشدہ تہذیب کے متلاشی نظر آتے ہیں جو یادوں کے ذریعے ماضی، روایت، تہذیب اور ورثے سے تعلق قائم رکھنے کی کوشش میں سرگرداں ہیں۔ ابتدا میں ان کے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ ماضی کی بازیافت اور جڑ کی تلاش تھا اس لیے وہ اس تلاش میں آفاق اور تاریخی ردیومالائی علامتوں کی دنیا سے رجوع کرتے ہیں۔ علامتی سفر کی ابتداء وہموں، وسوسوں، پرانی، حویلیوں، گھروں، درختوں، آسمانوں، الوئوں، بلیوں، املی کے پیڑوں، دفن شدہ خزانوں سے ہوتی ہے۔ انتظار حسین ان سب چیزوں کو کئی سو سالہ ہند و مسلم تہذیب کے پس منظر میں بیان کرتے ہیں اس لیے یہ چیزیں زندہ وجود کی صورت میں ظہور پذیر ہونے لگتی ہیں جو اپنے اندر مفاہیم کا جہاں بسائے ہوئے ہے بہ قول گوپی چند نارنگ:

"انتظار حسین کے کردار، انکی علامتیں دوسرے افسانہ نگاروں سے اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ یہ ان کے اپنے تہذیبی شعور کی پیداوار ہیں۔"(28)

انتظار حسین اپنے ابتدائی علامتی سفر میں ہند و مسلم تہذیب کی نمائندہ عمارات، محفلوں، میلوں ٹھیلوں، بچھڑے رشتوں، گلیوں بازاروں، چوکوں وغیرہ کی جذباتی علامتوں کے ساتھ اسلامی اساطیر میں صرف اپنے فرقے کی مخصوص علامتوں کو برتتے نظر آتے ہیں لیکن ان کی اس ابتدائی فکر نے فن کی نئی منزل کو تلاش کیا اور اب ان کے سامنے مسائل بدل گئے وہ ماضی اور تہذیب کی بازیافت کو چھوڑ کے معاشرے، تہذیبوں اور قوموں کے زوال پذیر ہونے اور انحطاط کا شکار ہونے جیسے مسائل کی طرف متوجہ ہوئے اور فرد کو ذات کے بحران اور داخلی کشمکش میں مبتلا پایا۔ اب ان کی کہانیوں کا موضوع انسان کا روحانی و اخلاقی زوال ہے۔ اس دوران وہ اردو افسانے کو فلسفیانہ و متصوفانہ جستجو سے آشنا کرتے ہوئے موجودہ دور کی افسردگی اور کشمکش کو تخلیقی لگن سے پیش کرتے ہیں یہاں ان کی علامتوں کا سلسلہ عہد نامہ عتیق و اساطیر اور صوفیہ کے ملفوظات سے جا ملتا ہے جس کی مدد سے وہ پیچیدہ مسائل کو بھی سہولت سے علامتی پیرائے میں ڈھال کے بیان کر دیتے ہیں۔ " آخری آدمی" کی کہانیاں اسی علامتی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

انتظار حسین آسمانی صحیفوں حکایتوں اور روایتوں سے اجزالے کر انہیں اپنے تمثیلی اور علامتی نظام کا حصہ بناتا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس کا تصور حیات اس کی تدبیر کاری اور اسلوب سے دو آتشہ ہو جاتا ہے اور اس کی تمثیلیں اور علامتیں بلیغ ہو جاتی ہیں۔ اس دور میں انتظار حسین پاکستان بننے کے بعد یہاں فرد کے تشخص کے کھونے اور معاشرے میں خوف اور لالچ کی تقویت کو علامتی پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ فرد کے روحانی و اخلاقی زوال کے بعد انتظار حسین نے ملک کے سیاسی اور سماجی مسائل کی طرف توجہ دی اور اس صورت حال کو علامتی پیرائے میں بیان کیا۔ ۷۰، ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۶ء تک عرصہ پاکستان کی ثقافت پہ بہت گراں گزرا۔ بدترین سماجی خلفشار میں ذہنی تحفظات کی شدید تباہی ہوئی۔ اردو کے ادیبوں کی سماجی حق تلفی کی گئی۔ کھوکھلے معاشی نعروں کی گرم بازاری میں تخلیقی ادب کی آواز دب گئی۔ اس کے بجائے سفلی تفریحات بہم پہنچانے والے ڈائجسٹوں، زرد اور یلو جرنلزم کو پروجیکٹ کرنے والے نام نہاد سوشل رسائل ڈھیروں کے حساب سے شائع ہونے لگے۔

انہوں نے اس اجتماعی زوال اور انحطاط کے دور میں ''شہر افسوس'' اور ''بستی'' آگے سمندر ہے'' جیسی تخلیقات سے معاشرے کے انحطاط اور فرد کے ارد گرد موجود سماجی و سیاسی صورت کو بھرپور معنویت کے ساتھ پیش کیا۔ان تخلیقات میں برتی گئیں علامات کا تعلق بھی دیومالائوں، ہندو مسلم اساطیر اور عصری حوالوں سے ہے جن کے سوتے تاریخ وتہذیب سے پھوٹتے ہیں۔ داستانوں کا حکایتی عنصر اور اساطیر کی معنیاتی بازیافت انتظار حسین کے فن کا حصہ ہے۔انتظار حسین کے علامتی سفر کا اگلا پڑائو بدھ جاتکیں ہیں جن کے توسعت سے انہوں نے موجودہ دور کے افسانوں کے نفسیاتی مسائل کی گتھیوں کو سلجھایا یہاں بدھ جاتکوں اور داستانوی کرداروں اور قدیم ہندی متھ سے علائم اخذ کی گئی اور موجودہ دور کے مسائل کو طنزیہ انداز میں قدیم دور کے حالات میں پیش کر کے دیکھا گیا کیوں کہ ان کے خیال میں یہ آدمی کی بنیاد میں خرابی کا معاملہ نہیں ہے بلکہ جس تہذیب کے سیاق وسباق میں یہ بات ہوئی ہے اس تہذیب کی تعمیر میں خرابی کی صورت مضمر تھی۔ یعنی یہ روحانی واخلاقی زوال اور نفسیاتی مسائل موجودہ تہذیب میں بگاڑ کی علامتیں ہیں جب تک یہ بگاڑ ٹھیک نہیں ہوگا قوم انحطاط کا شکار ہی رہے گی۔

انتظار حسین ادب کو روایت کے پس منظر میں پروان چڑھتا دیکھنے کے قائل ہیں ان کے نزدیک اگر ادب روایت سے کٹ جائے تو اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکے گا یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقات میں برتی گئی علامتوں کو ٹرائے کا گھوڑا نہیں بننے دیتے بل کہ انہیں اپنے تہذیبی پس منظر سے اخذ کر کے جدید علامتی پیرائے میں ڈھال دیتے ہیں۔اسی لیے وہ اپنی علامت نگاری کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہوں نے ٹی ایس لارنس کو پڑھا کافکا کو پڑھا۔ جو مغربی فکشن تھا اس سے تعلق پیدا ہو۔ لیکن Back Ground Inspiration تو اسلام قرآن اور داستان سے تھی لیکن وہ جو کہانیاں تھیں جو ہماری دادی اماں سنایا کرتی تھیں وہ فوک لٹریری Vision تھا ہمارا تو وہ بھی سارا Back Ground ہے اب ہم محض اس ماحول میں تو پیدا نہیں ہوئے وہ آج گلبرگ کی لڑکی جس ماحول میں پیدا ہوئی ہے کہ وہ صرف انگلش فکشن کو جانتی ہے اور وہ آگے پیچھے کچھ نہیں جانتی۔ یعنی انتظار حسین کا علامتی سفر مشرق سے شروع ہوتا ہے اور ارتقا کی مختلف منازل طے کر کے مشرق ہی میں پلٹ آتا ہے جس کی بنیادی وجہ اپنی تہذیبی روایات اور ان سے اخذ کردہ علامتوں سے دلچسپی ہے۔انتظار حسین کا یہ کارنامہ معمولی نہیں کہ انہوں نے افسانے کی مغربی ہیت کو جوں کا توں قبول نہیں کیا۔ بلکہ کتھا کہانی اور داستان وحکایت کو جو مقامی سانچے Models Indigenous مشرقی مزاج عامہ اور افتاد ذہنی کے صدیوں کے عمل کا نتیجہ تھے اور مغربی اثرات کی یورش نے جنہیں رد کر دیا تھا، انتظار حسین نے اس کی دانش وحکمت کے جوہر کو گرفت میں لے لیا اور ان کی مدد سے مروج سانچوں کی تقلیب کر کے افسانے کو ایک نئی شکل اور نیا ذائقہ دیا۔ ترقی پسند تحریک کا سارا زور معاشرتی مسائل اور معاشرتی مساوات پر صرف ہوا جس سے معاشرے میں فرد کی اہمیت کم ہو گئی۔اس کے رد عمل کے طور پر ایسا رجحان ابھرا جس نے اصل اہمیت فرد کو دی۔ جدید دور کی تنہائی اور علاحدگی نے بھی انسان کو اپنے داخل میں جھانکنے پر مجبور کر دیا۔ باطن میں جھانک کے اس کی پیچ دار تہوں کو اظہار میں لانا آسان نہ تھا اسی لیے اسی باطنی اظہار کو علامتی انداز میں بیان کیا گیا جس سے علامتی نگاری ذریعہ اظہار قرار پائی۔

جدید علامتی افسانے کا آغاز پچاس کی دھائی کے آخری چند سالوں میں ہوا جو ۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۰ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ یہ دور دنیائے علم وادب، سائنس اور ٹیکنالوجی کے حوالے سے بڑا ہنگامہ خیز تھا الیکٹرونکس کے میدان میں نئی نئی ایجادات سامنے آرہی تھیں۔آدمی پہلی بار دنیا کے حصار کو توڑ کر ۱۹۶۹ء میں چاند تک پہنچ گیا۔ طبیعیات ،حیاتیات، طب میں خاطر خواہ پیش رفت ہوئی پرانی اقدار اور نظریات وروایات پر ضرب لگانے کا رجحان فروغ پانے لگا اس دور میں جہاں مغرب میں اسٹرکچرل ازم کو فروغ ہوا وہیں ہمارے ہاں معاشی مسائل، معاشرتی واخلاقی اقدار کے نئے پیمانے زندگی کے بدلتے تصورات، تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی نے گھر اور خاندان کی مرکزیت پر ضرب لگانا شروع کر دیا۔ گویا اس دور میں پرانے نظریات کو تج کر حقائق کو نئے نقطہ نظر اور نئے زاویہ نگار سے جانچنے کا ایک عالمی رویہ وجود میں آیا۔ جس سے انسانوں میں فنی وفکری سطح پر انحراف کی واضح اشکال نمودار ہونے لگیں۔ اقدار کی لحہ بہ لحہ شکست وریخت، ذات کا بحران، بے چہرگی کا المیہ ماحول، بے چینی، نفرت اور دہشت کی فضا نے فکشن میں نئے رویوں اور رجحانات کو فروغ بخشا۔

ان سب تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ بیسویں صدی کے سیاسی منظر نامے نے بھی ادبی منظر نامے میں بڑی تبدیلیاں کی ہیں۔اس صدی میں ہونے والی دو عظیم جنگوں نے انسانی مستقبل کے سامنے سوالیہ نشان لگا دیا۔ انیسویں صدی کے صنعتی انقلاب نے جس خیالی دنیا کا خواب دیکھا یا تھا وہ چکنا چور ہو گیا۔ ہوس پرستی، اقربا پروری، زراندوزی، مشینوں کی حکومت نے انسان کو زوال پذیر کر کے تباہی کے دہانے تک پہنچا دیا۔آدمی آدمی سے مایوس ہو گیا اسی لیے اس صدی کا ادب اضطراب وخلفشار کا ادب ہے جو کھوئے ہوئے انسانی رشتوں، پائیدار اخلاقی قدروں اور جاندار روایتوں کی تلاش کا ادب ہے جسے بے چین اور زخمی اعصاب کا ادب کہا جا سکتا ہے۔ تخلیق کار کے لیے ہی بات ناقابل قبول ہے کہ انسان اتنا بدل جائے کہ وہ انسان ہی نہ رہے اپنی انسانی خوبی کھو بیٹھے اور خود چلتی پھرتی مشین بنا لے اور اپنی فطری، جذباتی، جبلی اور روحانی ضرورتوں سے منہ موڑ لے یہی وجہ ہے

کہ اس دور کے ادب میں ذات کی تلاش، جڑوں کی تلاش، انسانی بنیادی رشتوں کی تلاش اور انسانی خصوصیات کی تلاش کے اہم رجحانات ملتے ہیں۔ کیونکہ فرد اس صدی میں وجودی وروحانی آشوب اور مسائل کا شکار ہوا جسے علامتی طریق کار کے ذریعے پیش کیا گیا ہمارے ہاں اس رجحان کی اولین اور بہترین مثال انتظار حسین ہیں۔ انتظار حسین کو اپنے معاصر افسانہ نگاروں پر یہ تفوق حاصل ہے کہ وہ کہنے کا ڈھنگ جانتا ہے وہ پیچیدہ سے پیچیدہ ذہنی جذباتی واردات کے بیان میں بھی، لفظوں کے نرخرے کٹنے نہیں دیتا، وہ اردو زبان و ادب سے تخلیقی سطح پر آشنا ہے دوسرے وہ اپنے عصری سوالوں اور حوالوں سے بیگانہ نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تاریخ و تہذیب کے پر اسرار اور پیچیدہ جنگل میں اتر کر اظہار وابلاغ کے علامتی وسیلے کو معتبر بناتا ہے۔ ان کی ابتدائی تخلیقات میں زیادہ تر اس دنیا کو آباد کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کی بساط لٹ چکی ہے کھوئے ہوئوں کی جستجو اور تہذیبی بازیافت ان کی ابتدائی تخلیقات کا موضوع ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ابتدائی علامتی دور میں جو علامت بار بار برتی گئی وہ ''قلب ماہیت'' کی ہے جس کے ذریعے انتظار حسین اخلاقی اقدار، شخصیت کے زوال اور اجتماعی اطمینان کے فقدان کو پیش کرتے ہیں۔ ان کی کہانیاں، اسی معنی میں اپنا جواز آپ ہیں۔ وہ عالم انسانیت کے گمشدہ خوابوں، گم کردہ نیکیوں اور فرد و مجموعی انسان کے کھوئے ہوئے یا فراموش کردہ بچپن کی معصومیتوں کا آموختہ ہیں۔ ایک ایسا شفاف آئینہ جو ہمیں اپنی ان صورتوں سے متعارف کراتا ہے جو قدرے مسخ ہو گئی ہیں، دھند میں اٹ گئی ہیں۔ افسانوی ادب میں پہلی مرتبہ انتظار حسین نے انسان کے اس عظیم المیے کا ہمیں احساس دلایا ہے کہ ہم نے اندھا دھند پانے کی ہر جستجو میں کیا اور کتنا قیمتی اثاثہ کھو دیا ہے۔ کیوں کہ فرد جس کرب اور آشوب ذات کا شکار ہے وہ نیا نہیں ہے۔ جذباتی، نفسیاتی، روحانی تشنگی و تنزلی، خیر و شر کی کشمکش ہر دور کے انسان کو درپیش رہی ہیں صرف حالات اور ماحول کی نوعیت بدلی جاتی ہے ورنہ جدید قدیم انسان کا درد و کرب ایک ہی ہے اسی لیے انتظار حسین لکھتے ہیں کہ جاتکوں سے یہ شعور پا کر آپ کے آدمی کے کرب کو سمجھا جا سکتا ہے انتظار حسین کی تلاش چوں کی گم شدہ تہذیب اور رشتوں کی بازیافت ہے وہ ماضی کی روح اور انسان وجود کے اس کٹے ہوئے حصے کی تلاش ہیں ہیں جو ماضی میں کھو گیا ہے کیونکہ اسکے بغیر انسانی وجود مکمل نہیں ہو سکتا اس کی تلاش کے لیے وہ مسلم تہذیب، ہندی گپتائوں، بودھوں، کوروئوں پانڈوئوں کے تہذیبی اختلاف، ہندو مسلم تہذیب اساطیر، عہد نامہ قدیم اولیاء انبیاء کرام کے واقعات کی طرف رجوع کرتے اور عہدہ وسطی کی روح سے داستانوی زبان میں مخاطب ہوتے ہیں۔ وہ ان قدیم کرداروں اور بے روح اشیا کو علامتوں کے طور پر برت کے تہذیبی گم شدگی اور انسانی اخلاقی وروحانی زوال، سماجی وسیاسی مسائل اور نفسیاتی الجھنوں کو پیش کرتے ہیں جو آج کے انسان کا المیہ اور درد ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ انتظار حسین کا تخلیقی فن آج زیادہ بامعنی ہو گیا ہے کیوں کہ ہم مسلسل اسی تہذیب وسیاسی شکست وریخت سے گزر رہے ہیں جس کا سامنا پاکستان بننے کے فوراً بعد لوگوں کو کرنا پڑا۔ انکی تحریروں کو پڑھ کر آج کا قاری بھی نامانوس اور اجنبی جہات کو دریافت کرنے کا خواہاں ہوتا ہے کیونکہ ان سب نامانوس اور اجنبی جہات سے اس کا تہذیبی لاشعوری تعلق ہے اس لیے انتظار حسین کی علامتیں آج بھی نئی نسل تک تہذیبی ورثہ منتقل کرنے کا باعث ہیں۔

حوالہ جات

1۔ ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر (مرتبہ): انتظار حسین ایک دبستان: دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہائوس ۱۹۹۶ء ص ۱۲۳

2۔ ایضاً، ص ۶۴۷

3۔ ایضاً، ص ۳۷

4۔ انتظار حسین، مکالمہ، ۳۰ اکتوبر ۲۰۱۰ء

5۔ شفیق انجم، ڈاکٹر: اردو افسانہ انیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں: اسلام آباد، پورب اکادمی: ۲۰۰۸ئ، ص ۲۵۶

6۔ انتظار حسین سے، مکالمہ، ۳۰ اکتوبر ۲۰۱۰ء

7۔ تحسین فراقی، ڈاکٹر: مکالمہ، ۲۶ جولائی ۲۰۱۱ء

8۔ سہیل احمد خاں: مجموعہ سہیل احمد خاں: لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز: ۲۰۰۹ء ص ۱۱۲

9۔ انتظار حسین ایک مطالعہ: ص ۲۳۴

10۔ انتظار حسین: علامتوں کا زوال: لاہور سنگ میل پبلی کیشنز: ۲۰۰۹ء ص ۲۱
11۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: افسانہ اور افسانہ نگار (تنقیدی مطالعہ): لاہور سنگ میل پبلی کیشنز: ۱۹۹۱ء ص ۵۰
12۔ انتظار حسین ایک دبستان، ص ۱۴۵، ۱۴۴
13۔ انتظار حسین: مجموعہ انتظار: لاہور سنگ میل پبلی کیشنز: ۲۰۰۰ء ص ۳۶۹
14۔ انتظار حسین ایک مطالعہ: ص ۱۵۵
15۔ انوار احمد، ڈاکٹر: اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ: فیصل آباد، مثال پبلشرز: ۲۰۱۰ء ص ۴۰۷
16۔ انتظار حسین ایک مطالعہ: ص ۳۴۵
17۔ ایضاً، ص ۸۷
18۔ ایضاً، ص ۱۹۸
19۔ علامتوں کا زوال: ص ۸
20۔ انتظار حسین ایک مطالعہ: ص ۲۳۴
21۔ علامتوں کا زوال: ص ۸
22۔ ایضاً، ص ۵۵
23۔ اعجاز راہی، ڈاکٹر: اردو افسانے میں اسلوب کا آہنگ: راولپنڈی، ریز پبلی کیشنز: ۲۰۰۳ئ، ص ۱۶۱
24 اشتیاق احمد (مرتب): علامت کے مباحث: لاہور، بیت الحکمت: ۲۰۰۵ئ، ص ۱۹۹، ۱۹۸
25۔ انتظار حسین ایک دبستان: ص ۲۳۴
26۔ اانتظار حسین سے مکالمہ: ۳۰ اکتوبر ۲۰۱۰ء
27۔ انتظار حسین، مکالمہ: ۳۰ اکتوبر ۲۰۱۰ء
28۔ انتظار حسین ایک دبستان: ص ۱۹۷۔۱۹۸